# معانی الآثار و مشکل الآثار للامام الطحاوی

از مولوی سید عبدالرزاق صاحب قادری جعفر ایم اے (عثمانیہ)

(۲)

اب رہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی کتاب! اس کا ذکر حدیث کی مختلف کتابوں میں پایا جاتا ہے خصوصاً اس سلسلہ میں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پوچھا جاتا تھا کہ کیا قرآن کے سوا بھی آپ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی کتاب ہے تو ارشاد فرماتے کہ ہاں میری تلوار کی نیام میں ایک کتاب ہے جس میں دیات وغیرہ کے مسائل کے ساتھ" الصدقات" کا بھی ذکر ہے. اس کتاب میں "اسامہ" کے صدقات کی جو کیفیت درج تھی اس کا ابوداؤد نے ذکر کیا ہے. حضرت علامہ کشمیری مولنا سید محمد انور شاہ کے حوالہ سے العرف الشذی کے جامع نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔ اما روایۃ ابی داؤد فصححھا ابن القطان فی کتاب الوھم والایھام (ص ۲۷۹)

ابن ابی شیبہ میں اس کتاب کے جو الفاظ ہیں وہ بجنسہ عراقیوں کا مذہب ہے نیز ابی داؤد کے الفاظ سے بھی اسی خیال کی تصدیق ہوتی ہے اور اجمالی تذکرہ تو حضرت علی کی اس کتاب کا بخاری میں بھی موجود ہے. بخاری کی ایک روایت میں اس کی بھی تصریح ہے کہ اس میں "الصدقات" کا بھی ذکر تھا. خود محمد بن الحنفیہ بن علی کرم اللہ وجہہ سے یہ الفاظ بخاری میں منقول ہیں کہ

| | |
|---|---|
| ارسلنی ابی خذ ھذا الکتاب فاذھب بہ الی عثمان فان فیہ امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الصدقۃ (ص ۴۳۸) | مجھے میرے والد صاحب نے یہ کہلا کر بھیجا کہ تم اس تحریر کو لیکر عثمان کے پاس جاؤ اس میں صدقہ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔ |

مگر باوجود اس تصریح کے حافظ ابن حجر کا یہ فرمانا کہ "ان فیہ اسنان الابل" جس سے گویا معلوم ہوتا ہے کہ الصدقات کا اس میں ذکر نہ تھا تعجب انگیز ہے علامہ کشمیری نے بھی تعجب سے پوچھا ہے کہ

کیف لم یفصح الحافظ بان فیہ احکام الزکوٰۃ۔ حافظ نے یہ ظاہر کیوں نہیں کیا کہ اس میں زکوٰۃ کے احکام تھے۔

علامہ کشمیری ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "الصدقات" کے باب میں جتنی کتابیں پائی جاتی ہیں ان کے متعلق ابن معین فرماتے تھے کہ حضرت علیؓ کی کتاب ان سب سے اعلیٰ تھی۔ یحییٰ بن معین کی اس توثیق کو نقل کرتے ہوئے علامہ کشمیری نے اپنی رائے یہ ظاہر فرمائی ہے کہ اگرچہ ابن معین نے اس کی تصریح نہیں کی کہ "کتابِ علیؓ" سے کونسی کتاب مراد ہے لیکن میرا خیال یہی ہے کہ اس سے کتاب الصدقات مراد ہے اور اس میں متعدد احکام تھے۔

بہرحال عمرو بن حزم کا نسخہ صدیقیہ نسخۂ فاروقیہ نسخۂ علویہ نسخۂ ان چاروں کتابوں کی جو حالت مختلف کتابوں میں ملتی ہے وہ تو یہی ہے۔ محدثین کے ایک طبقہ کا خیال تو یہ ہے جیسا کہ ابنِ معین کے حوالہ سے نقل کیا جاتا ہے کہ

لا یصح فی ھذا حدیث فی الصدقات[1] اس سلسلہ میں صدقات کے بارہ میں کوئی ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے

گویا اس کے یہ معنی ہوئے کہ حضرت علیؓ کی کتاب کی سند کے متعلق ان کی جو رائے پہلے نقل کی گئی ہے اس کی حیثیت ایک اضافی رائے کی ہے یعنی دوسری روایتوں کے مقابل میں نسبتاً صحت سے وہ روایت زیادہ قریب ہے۔ بعضوں نے تمام نسخوں کے اسناد کی مجموعی حیثیت کو پیش نظر رکھکر یہ رائے قائم کی ہے جیسا کہ ابن جریر الطبری کے حوالہ سے العرف الشذی میں منقول ہے

ان الحق ان قول الحجازیین والعراقیین حق یہ ہے کہ حجازیوں اور عراقیوں دونوں کے قول صحیح ہیں

---

[1] العرف الشذی ص ۲۷۹ ۔ [2] الجوہر النقی ص ۸۹ ۔

صحیحان تتادی الزکوٰۃ علی الترتیبین (ص ۲۹) زکوٰۃ دونوں ترتیبوں کے مطابق ادا ہو جائے گی۔

علامہ کشمیری نے ان دونوں طریقوں کی تصحیح کی ایک دوسری راہ بھی پیدا کی ہے وہ فرماتے ہیں۔

نقطع بان الترتیبین ثابتتان — ہم کو یقین ہے کہ دونوں ترتیبیں ثابت ہیں کیونکہ زکوٰۃ
فان الزکوٰۃ اخذت فی عہدہ — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء اربعہ کے عہد میں وصول
علیہ السلام وعہد الخلفاء الاربعۃ — ہوتی رہی ہے اور زکوٰۃ ان مسائل میں سے ہے جن پر سلف کا
والتی مما تعامل بہ السلف ولا یمکن — تعامل ہے۔ اس بنا پر دونوں میں سے کسی ایک قول کو
اخفاء قول عن القولین ولا مساغ — چھپانے کا امکان نہیں ہے اور نہ ان میں سے کسی
لانکار احدہما — ایک کے انکار کی گنجائش ہے۔

بلکہ اس معیار پر انھوں نے علامہ عبد العلی بحر العلوم کے اس شبہ کا جواب بھی دیا ہے جو حنفی نقطہ نظر کی تنقید کرتے ہوئے "ارکان اربعہ" میں انھوں نے ظاہر فرمایا ہے۔ محدث کشمیری کا بیان ہے کہ

والعجب مما قال بحر العلوم فی — ارکان اربعہ میں بحر العلوم نے جو کچھ کہا ہے اس پر بڑا تعجب ہے
الارکان الاربعۃ ان مثل الزکوٰۃ — کہتے ہیں زکوٰۃ تو سلف کے معمولات میں سے ہے اور اس
مما عمل بہ السلف ولا بد فیہ من — کے لئے ایک دلیل متواتر کی ضرورت ہے۔ مگر یہی
دلیل متواتر وانما دلیل العراقیین — طحاوی میں عراقیوں کی دلیل تو وہ خبر واحد ہے۔
فی الطحاوی خبر واحد فلا یقبل۔ — اس کو قبول نہ کیا جائیگا۔

طحاوی کی کتاب کے ساتھ حنفیوں کی دلیل کو مختص کر دینا مولانا بحر العلوم کے دعوے کی اس کمزوری کے سوا سب سے بڑی بات یہی ہے جو علامہ کشمیری نے فرمائی ہے کہ تواتر کے لئے اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس پر عمل خلافت کے عہد میں اور ابن مسعود، سفیان ثوری اور ابو حنیفہ کے عہد تک ہوتا ہو۔ مطلب یہی ہے کہ علاوہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے ایام خلافت کے

ابن مسعود جیسے صحابی سے بھی اسی فتوی کا منقول ہونا جو عراقیوں کا خیال ہے پھر سفیان ثوری اور امام ابوحنیفہؒ کا بھی اسی مسلک کو ترجیح دینا یہ ساری باتیں اس کی تائید کرتی ہیں کہ یہ نقطہ نظر بھی بے اصل نہیں ہے۔ اور دونوں خیالات اپنے ساتھ موجبات رکھتے ہیں۔

شاہ صاحب نے ابن مسعودؓ اور سفیان ثوری وغیرہ کا جو نام لیا ہے یہ دراصل ان آثار کی طرف اشارہ ہے جو ابن مسعودؓ سے خود طحاوی نے بھی نقل کیا ہے اور ان کے سوا بھی دوسری کتابوں میں ان کا فتوی منقول ہے۔ سفیان ثوری کا بھی یہی قول تھا۔ اس کی تصریح تو ترمذی میں موجود ہے اور ابوحنیفہؒ کا قول تو ظاہر ہی ہے کہ یہی ہے۔

بہر حال اس وقت اس مسئلہ کے مالہ و ماعلیہ کو پیش کرنا میرے سامنے نہیں ہے اس لئے اصل مسئلہ کے متعلق اسی بیان کو کافی قرار دیتے ہوئے میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ طحاوی نے حدیث کے علم الاسناد کے متعلق اپنی دقت نظر کا جو ثبوت متعلقہ روایتوں کی تنقید میں پیش کیا ہے اس سے ان کی فن اسناد میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے طحاوی نے حسب دستور نقل مذاہب و ہر مذہب کے دلائل کو نقل کرنے کے بعد پہلے تو یہ لکھ کر کہ

فلما اختلفوا فی ذلک وجب النظر لنخرج — جب وہ اس میں مختلف ہوں تو اب غور کرنا ضروری ہے تاکہ
من ھذہ الثلثۃ الاقوال قولا صحیحا — ہم ان تینوں اقوال سے قول صحیح نکالیں۔

اپنے خاص نظری طریقہ سے یعنی مذہب کے کلیات کی روشنی میں اس جزئی خلافیہ کے متعلق اس پہلو کے رجحان کے وجوہ پیش کئے ہیں اور اس کے بعد یہ ارقام فرماتے ہیں کہ

فثبت بما ذکرنا قول من ذھب الی — پس جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس سے ان لوگوں کا قول ثابت
المقالۃ الثالثۃ وممن ذھب الیھا — ہو جاتا ہے جو مقالہ ثلاثہ کی طرف گئے ہیں اور ان میں سے
ابو حنیفۃ وابو یوسف ومحمد۔ — ابوحنیفہ ابویوسف اور محمد ہیں۔

پھر ابن مسعود ابراہیم نخعی دونوں حضرات کے فتووں کو درج کرنے کے بعد خود ہی سوال اٹھاتے ہیں

فان احتج اھل المقالۃ الثانیہ لمذھبہم فقالوا معنی الآثار المتصلۃ شاھدۃ لقولنا و لیس ذلک مع مخالفنا۔ اگر اہل مقالۂ ثانیہ اپنے مذہب کے لئے احتجاج کرتے ہوئے کہیں کہ آثار متصلہ تو ہمارے قول کے لئے گواہ ہیں اور ہمارے مخالفین کے پاس ایسے آثار ہیں نہیں۔

مقصود یہ ہے کہ شوافع (جنھیں وہ اہل المقالہ الثانیہ کہتے ہیں) ان کی طرف سے یہ دعویٰ پیش کیا جاتا ہے کہ شریعت کے کلیات یا صحابہ و تابعین کے فتاوی کا کچھ ہی اقتضا ہو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو چیزیں اس باب میں مروی ہیں ان میں ایسے آثار جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بغیر کسی انقطاع کے متصل سند کے ساتھ منسوب ہیں ان سے تو ہمارے قول ہی کی تائید ہوتی ہے اور اس قسم کی روایتیں مخالف کے پاس نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ شوافع کا مندرجہ بالا دعویٰ دراصل دو مستقل جزوں پر مشتمل ہے۔

(۱) جن حدیثوں سے ہمارے قول کی تائید ہوتی ہے وہ متصل الاسناد ہیں۔

(۲) مخالفین جن حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں ان کی نوعیت یہ نہیں ہے۔

**قبول مراسیل کی بحث** امام طحاوی نے دونوں جزوں پر علم الاسناد والرجال کی روشنی میں بحث کی ہے پہلے جز کے متعلق تو انھوں نے اصول حدیث کے مسلمہ ضوابط کی بنیاد پر دکھایا ہے کہ ان حدیثوں کے اتصال کا دعویٰ صحیح نہیں ہے بلکہ طحاوی کے الفاظ میں "ان کل ماروی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ھذا الباب منقطع" مطلب وہی ہے کہ جن جن حدیثوں کے اتصال کا دعویٰ کیا جاتا ہے تحقیق ثابت کرتی ہے کہ سب کی سب منقطع روایتیں ہیں یعنی بیچ کا راوی غائب ہوگیا ہے اور انقطاع یا ارسال اگرچہ عام علمائے امت کے نزدیک ہر حال میں روایت کو مسترد کرنے کے لئے کافی نہیں ہے ابن جریر طبری کے

حوالہ سے کتابوں میں منقول ہے کہ تمام تابعین مرسل کے قبول کرنے پر متفق ہیں۔ دو سو سے پہلے کسی امام نے اس کے قبول کرنے سے انکار نہیں کیا۔ (مقدمہ فتح الملہم ص ۴۴)

علامہ ابن عبد البر نے اس علائی کلام میں تخصیص پیدا کر کے یہ لکھا ہے کہ بشرطیکہ مرسل غیر محتاط اور غیر ثقات سے ارسال کرنے والا نہ ہو۔ اور یہی واقعہ بھی ہے اور تمام احناف کا مسلک بھی یہی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص کی عدالت وسعت بصیرت اور نقد کی قوت بیداری و دیانت کا تجربہ ہو چکا ہو اگر وہ درمیان کے راوی کا ذکر ترک کر کے کسی حدیث کو براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک منسوب کرنے کی جرأت کر رہا ہے تو کل دو حال ہیں۔ یا اس آدمی کی عدالت و دیانت کے سارے فصول کو افسانہ قرار دیا جائے اور اگر ان کی روایت کا انتساب صحیح ہے تو کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ ایک ایماندار آدمی مطمئن ہونے سے پہلے کسی بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دے؟ ابراہیم نخعی تو علانیہ اس کا اظہار کرتے تھے کہ "اذا قلت حدثنی فلان عن عبداللہ ابن مسعود فهو الذی رواہ" یعنی اپنے اور عبداللہ بن مسعودؓ کے درمیان کے راوی کا نام جب میں ظاہر کر دوں تو سمجھو کہ اس راوی کے سوا اور کسی سے یہ روایت میں نے نہیں سنی ہے لیکن "اذا قلت قال عبداللہ فغیر واحد" یعنی درمیان کے راوی کا نام حذف کر کے کسی بات کو براہ راست عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف میں منسوب کر دوں تو یقین کرنا چاہئے کہ ایک سے زائد راویوں سے یہ بات میں نے سنی ہے خواجہ حسن بصریؒ سے بھی اسی قسم کا اعتراف منقول ہے۔

| | |
|---|---|
| قال الحسن متی قلت لکم حدثنی فلان فهو حدیثه ومتی قلت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فمن سبعین سمعته أو اکثر۔ (مقدمہ فتح الملہم ص ۴۴) | حسنؒ فرماتے ہیں جب میں تم سے حدثنی فلان کہوں تو سمجھو یہ فقط اسی ایک شخص کی روایت ہے اور اگر میں قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے یہ روایت ستر یا اس سے زیادہ طرق سے سنی ہے۔ |

الغرض مراسیل سے استدلال سلف کا ایک عام دستور تھا اور دوسری صدی کے اختتام تک اہلِ علم کا یہی طریقہ رہا۔ مگر جیسا کہ ابوداؤد صاحب سنن اپنے اس خط میں جو اہلِ مکہ کے نام انھوں نے لکھا تھا، امام شافعیؒ کی نسبت لکھتے ہیں۔

"حضرت امام شافعی پہلے آدمی ہیں جنھوں نے مراسیل سے یعنی ان روایتوں سے جن کا راوی بیچ سے غائب ہوگیا ہو خواہ وہ روایت کسی کی ہو نا قابلِ احتجاج قرار دیا"[1] یہ ثابت کرنے کے بعد کہ اس باب میں جن حدیثوں سے شوافع احتجاج کر رہے ہیں سب کی سب منقطع ہیں۔ طحاوی نے بھی شوافع کو مخاطب کر کے پوچھا ہے۔ کہ جب منقطع روایتیں آپ کے یہاں حجت نہیں ہیں تو پھر دوسرا بیچارہ اگر بدقسمتی سے مرسل حدیثوں کو دلیل میں پیش کرتا ہے تو آپ ارسال کا عیب نکال کر اس حدیث کو کیوں رد فرما دیتے ہیں آخر اس باب میں آپ کا سرمایہ بھی تو مرسل اور منقطع[2] کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ طحاوی نے اس کے بعد لکھا ہے

| | |
|---|---|
| فلئن وجب ان یکون عدم الاتصال | اگر عدم اتصال کسی جگہ میں قبولِ خبر کو |
| فی موضع من المواضع یزیل قبول الخبر | زائل کر دیتا ہے تو ضروری ہے کہ تمام |
| فینبغی ان یکون کذلک فی کل المواضع | جگہوں پر حکم یہی ہو۔ |

مقصد یہ ہے کہ پھر یہاں بھی عدمِ اتصال کے عیب کی وجہ سے چاہئے تھا کہ ان منقطع روایتوں کو آپ لوگ رد کر دیتے لیکن جب یہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان ہی کو احتجاج کے قابل قرار دیا گیا ہے تو جس شخص نے ارسال یا انقطاع کیا ہے اس پر اعتماد کرتے ہوئے جب ایک جگہ مرسل حدیث سے استدلال روا جائز قرار دیا تو پھر دوسروں کو بھی آئندہ ٹوکنے کا حق نہ ہوگا کہ وہ بھی تو اسی وجہ سے ان حدیثوں کو قابل

---

[1] فتح الملہم ص ۴۴۔ [2] مرسل اور منقطع کے الفاظ میں بعض دفعہ فرق کیا جاتا ہے یعنی کبھی تو صرف تابعی کی حدیث کو جس میں صحابی کا نام ظاہر نہ کیا گیا ہو مرسل کہتے ہیں اور تابعیوں کے نیچے والے رواۃ اگر سلسلہ کے کسی راوی کو چھوڑ دیں تو اسے منقطع کہتے ہیں۔ چند رواۃ اگر مسلسل چھوڑ دیے گئے ہوں تو اسے معضل کہتے ہیں۔ یہاں ارسال و انقطاع دونوں کو مترادف قرار دیا گیا ہے۔

احتجاج سمجھتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ امام طحاویؒ نے اپنی اس جزئی بحث میں ایک اہم اصولی مسئلہ کو بھی طے کر دیا ہے اور شافعیوں کے لئے کوئی چارہ کار اس کے سوا باقی نہیں رہ جاتا کہ یا تو مرسل حدیثوں کو قابلِ احتجاج مان لیں یا پھر تسلیم کر لیں کہ ما بہ النزاع مسئلہ میں اپنے دعوے کے ثبوت کے متعلق ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے مگر جب خود ان کے امام نے اپنی کتاب میں ان ہی روایتوں سے جن کا اتصال ثابت نہیں ہے احتجاج کیا ہے تو اس کا کھلا ہوا مطلب یہی ہوگا کہ ارسال کے عیب ہونے کا دعوی کلیۃً صحیح نہیں ہے اور یہ واقعہ ہے کہ حنفیہ بھی مرسل کو کلیۃً قابلِ احتجاج نہیں سمجھتے۔ ابنِ ہمام نے تحریر میں تصریح کی ہے کہ مراسیل اسی وقت حجت ہو سکتے ہیں جب مرسل یعنی ارسال کرنے والے راوی میں حسب ذیل صفات پائے جاتے ہوں۔

اذا کان ثقۃ عدلاً غیر غاش للمسلمین فی جبکہ راوی ثقہ ہو، عادل ہو، دین کے معاملات میں مسلمانوں

دینھم وکان اماماً من ائمۃ النقل لا یحدث سے خیانت نہ کرتا ہو، ائمہ نقل میں سے ہو، ہر سنی سنائی بات

بکل ما سمع ویعرف صدق الراوی کو نقل نہ کر دیتا ہو، راوی کے جھوٹ اور سچ میں امتیاز

عن کذبہ ولہ اھلیۃ الجرح والتعدیل کر سکتا ہو، اس میں جرح و تعدیل کی اہلیت اس حد

بحیث لا یکاد یخفی علیہ اقوال لمتاھیر تک ہو کہ اس کے زمانہ کے مشاہیر کے اقوال اس سے

من اھل عصرہ واکبر رائھم فی مخفی نہ ہوں اور محذوف راوی کی نسبت ان کی

الراوی المحذوف۔ بڑی رائے اسے معلوم ہو۔

اور یہ صفات تو مرسل میں ہونا چاہئے۔ ماسوا اس کے مرسل کے طریقہ بیان کو بھی دیکھا جائیگا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہوئے اس نے کس قسم کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ابنِ ہمام لکھتے ہیں۔

مع ذلک کلہ یسند الحدیث ان تمام باتوں کے ساتھ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف

الی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم — منسوب کی جائے تو "عن" یا "روی" یا اسی قسم کے کسی اور
لا بصیغۃ عن او روی او نحوہما — صیغے کے ساتھ سند نہ کی جائے بلکہ راوی کو "قال" کہنا
بل بصیغۃ قال التی تدل علی الجزم — چاہیے جو یقین اور جزم پر دلالت کرتا ہے۔

ابن ہمام نے ان امور کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

فالعادۃ قاضیۃ بحصول غلبۃ الظن — عادت حکم کرتی ہے کہ مرسل ان شرائط کے ساتھ ہوگی
بمثل ھذا المرسل الذی جاء بہ ھذا المجی — تو اس سے غلبۂ ظن کا فائدہ حاصل ہو جائیگا۔

کوئی شبہ نہیں کہ جن قیود کے ساتھ ابن ہمام نے مرسل کی حجیت کو مقید اور جن شروط کے ساتھ اسے مشروط کیا ہے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے حدیث کی صحت کے متعلق غلبۂ ظن کا پیدا ہو جانا ایک قدرتی اور عقلی بات ہے اور ظاہر ہے جن حدیثوں کی سندیں متصل ہوتی ہیں ان سے بھی غلبۂ ظن ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ قطعی یقین تو اتصال سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ سچ پوچھئے تو ابن ہمام نے قبولیت مراسیل کے متعلق جن قیود کا اضافہ کیا ہے درحقیقت امام طحاوی کے الفاظ "تقۃ من صمد بہ الیہ" کے اجمال میں وہ سب تفصیلات پوشیدہ ہیں اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ابن ہمام جیسے متاخرین حنفیہ نے بعد کو مراسیل مقبولہ کے متعلق خصم کے اعتراضات سے پریشان ہو کر ان قیود کا اضافہ نہیں کیا ہے بلکہ آٹھویں صدی ہجری میں اس اجمال کی تفصیل کی گئی ہے جس کا اظہار تیسری صدی میں طحاوی نے کیا تھا۔
میں نے قصداً اسی لئے اس بحث میں ذرا زیادہ طوالت سے کام لیا کیونکہ نزاعی مسئلہ تو ایک معمولی خلافیہ ہے لیکن امام طحاوی نے اس کے ذیل میں ایک بڑے اہم کلیاتی اختلاف کو بھی طے کر دیا ہے۔ شافعیوں کی ایسی گرفت کی ہے کہ آئندہ مراسیل کے عدم احتجاج کے دعوے کے دہرانے کی انھیں ہمت نہیں ہو سکتی۔

خیر یہ تو ایک کلی بحث تھی۔ اب میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ شوافع کے دعوے کے پہلے جزء

یعنی "الآثار المتصلہ شاہدۃ لقولنا" کی تنقید میں امام طحاوی نے اپنی ژرف نگاہی کا کتنا بہترین ثبوت پیش کیا ہے

**دعوی کے جزو اول کی تنقید**

بات یہ ہے کہ اس مسئلہ میں شوافع کو دراصل دو متصل روایتوں پر ناز ہے پہلی روایت تو وہی حضرت انس رضی اللہ عنہ والی ہے جس کا نام میں نے نسخۂ صدیقیہ رکھا ہے میں نے کہا تھا کہ یہ روایت بخاری میں بھی موجود ہے اور ایک سے زائد جگہ امام بخاری نے اس حدیث کو درج کرکے مختلف مسائل پیدا کئے ہیں لیکن جیسا کہ علامہ کشمیری کا بیان ہے کہ اما دلیل الشافعیۃ فاخرج البخاری ست مرات بسند واحد (العرف الشذی ص ۲۷۹)

حالانکہ امام بخاری کا جو عام دستور ہے یہ اس کے خلاف ہے۔ یعنی حتی الوسع وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ مکررات میں سندوں کو بدلتے چلے جائیں۔ اسی لئے محدث کشمیری کا فیصلہ ہے کہ "ولم یجد اعلی من ذلک السند" بہر حال بخاری نے جس سند سے اس روایت کو چھ جگہ اپنی کتاب میں دہرایا ہے وہ وہی سند ہے جسے طحاوی نے بھی اپنی اس سند سے معانی الآثار میں درج کیا ہے۔ محمد بن عبداللہ الانصاری قال حدثنی ابی عن ثمامہ عن انس الحدیث۔

طحاوی نے بخاری کی اس متصل روایت کے متعلق بجائے اتصال کے انقطاع کو کس طریقہ سے ترجیح دی ہے۔ قبل اس کے کہ اس کا ذکر کیا جائے یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ سند کے راویوں کا حال بیان کردیا جائے کہ بات اس کے بعد بالکل واضح ہوجاتی ہے۔

جیسا کہ میں پہلے ہی بیان کر آیا ہوں یہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہے ان کو حضرت ابوبکر نے بحرین صدقات کی وصولی کے لئے بھیجا تھا اور یہ کتاب لکھ کر دی تھی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ آخر زمانہ میں اپنی جاگیر میں جو بصرہ میں تھی منتقل ہوگئے تھے اور اسی کو انھوں نے وطن بنایا تھا۔ اسی وجہ سے ان کی اولاد بھی بصرہ میں آباد ہوئی اور اس سند کی یہ لطافت ہے کہ اول سے آخر تک کل رُواۃ حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ ہی کی نسل سے ہیں۔ پہلے راوی یعنی محمد بن عبداللہ الانصاری

والد کا نام عبداللہ اور عبداللہ کے والد کا نام المثنیٰ ہے۔ المثنیٰ کے والد کا نام عبداللہ اور عبداللہ حضرت انسؓ کے صاحبزادے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ محمد بن عبداللہ حضرت انسؓ کے تین واسطوں سے پوتے ہیں یعنی تین واسطوں سے ان کا نسب حضرت انسؓ تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ بصرے کے مشہور قاضیوں میں گزرے ہیں۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ انصاری اپنے وقت پر برابر حدیث بیان کرتے رہے یہاں تک کہ یہیں ان کا رجب ۲۱۵ھ میں انتقال ہو گیا۔ ان محمد بن کا ترجمہ حافظ ذہبی ابو یوسف و زفر کی اقتدا کرتے ہیں۔ پھر لزام کے بعد حسب دستور ان کے باب حدیث کے بارے میں اختلاف کا پیدا ہو جانا ضروری تھا لیکن بہر حال جب امام بخاری نے ان کو اپنے استاذوں میں شریک کر لیا ہے تو امام ابوحنیفہ کے مقلدوں پر نہ ہی امام بخاری کے مقلدوں پر تو ان کا یہ فعل حجت ہے اور ان کی نجات کے لئے یہ کافی ہے۔ الانصاری کے والد کا نام عبداللہ بن المثنیٰ بن عبداللہ بن انس ہے یعنی حضرت انسؓ کے عبداللہ بن مثنیٰ پر پوتے ہیں۔ ان کے متعلق محدثین کی رائیں مختلف ہیں۔ "صالح شیخ تضعف" الفاظ کے ساتھ ساتھ امام نسائی کا بیان ہے "لیس بالقوی" ابن حبان نے گو اپنی کتاب الثقات میں ان کو بھی جگہ دی ہے لیکن "ربما اخطاء" انھوں نے بسا اوقات خطا بھی کی ہے کے ساتھ۔ ابوداؤد نے تو صاف اعلان کیا "لا اخرج حدیثہ" میں ان کی حدیث نہیں بیان کرونگا۔ کبھی کبھی ان کی سند سے حدیث بیان کرتے بھی ہیں تو اس جملہ کے ساتھ "لم یکن من القریتین عظیم" یعنی کوفہ اور بصرہ عراق کے دو مرکزی شہروں میں ان کا شمار بڑے لوگوں میں نہ تھا۔ یہاں تک تو غنیمت ہے۔ ابن معین سے تو "لیس بشئ" یعنی پھر کچھ بھی نہیں کا لفظ منقول ہے اور الساجی کا بیان تھا کہ "فیہ ضعف لم یکن من اھل الحدیث روی مناکیر" العقیلی کا بھی یہی فیصلہ ہے "لایتابع علی اکثر حدیثہ" اسی لئے حافظ ابن حجرؒ نے امام دارقطنی سے نقل کیا ہے کہ "ثقۃ وقال مرۃ ضعیف" یہ موافق اور مخالف دونوں رائیں تہذیب التہذیب سے نقل کی گئی ہیں۔

تیسرے راوی ثمامہ ہیں اور مذکورہ بالا حدیث ان ہی کے نام کی طرف منسوب ہے طحاوی نے

بھی حدیث ثمامہ کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے براہ راست پوتے ہیں۔ والد کا نام عبد اللہ تھا۔ بصرہ میں جب حکومت نے آپ کو قاضی مقرر کرنا چاہا تو ابن سیرین سے مشورہ کیا۔ انھوں نے انکار کا مشورہ دیا۔ ثمامہ نے جواب میں کہا کہ حکومت مجھے نہیں بخشے گی۔ ابن سیرین نے کہا کہدو کہ میں قاضی ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ بولے تو کیا جھوٹ بولوں۔ کہتے ہیں کہ ان کی یہ بات ابن سیرین کو پسند آئی۔ بہرحال بصرہ کے قاضی مقرر ہوئے اور چار سال بعد معزول بھی ہوئے۔ جہاں تک اندازہ سے معلوم ہوتا ہے۔ روایت حدیث بطور درس کے ان کا مشغلہ نہ تھا۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ "کان قلیل الحدیث" تاہم اپنے دادا انس سے بھی اور براء بن عازب اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم صحابیوں سے روایت کرتے تھے۔ ائمہ رجال کا خیال گو ان کے متعلق کچھ مختلف ہے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے "روی عن ابی یعلی ان ابن معین اشار الی تضعیفہ" لیکن ان کے سوا امام احمد بن حنبل النسائی ابن حبان ابن عدی ان سبھوں نے ان کی توثیق ہی کی ہے۔ ابن عدی نے آخری فیصلہ ان کے متعلق ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ۔

| | |
|---|---|
| لہ احادیث عن انس وارجوانہ | انھوں نے انس سے حدیثیں روایت کی ہیں اور میں امید |
| لا باس بہ واحادیثہ قریبۃ | کرتا ہوں کہ ان میں کوئی اندیشہ نہیں ہے ان کی احادیث |
| من غیرہ وھو صالح فیما یرویہ | دوسروں کے قریب ہی ہیں اور انس سے جو روایتیں بیان |
| عن انس عندی۔ | کرتے ہیں میرے نزدیک ان میں صالح ہیں۔ |

جس کے یہی معنی ہوئے کہ کم از کم اپنے دادا حضرت انسؓ کی روایتوں کی حد تک ان کو معتبر ہی شمار کرنا چاہیے اور جس روایت سے اس وقت بحث ہے وہ حضرت انسؓ ہی کی ہے۔

یہ تو اس سند کے رواۃ کا حال تھا۔ اب اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ثمامہ بن عبد اللہ بن انس قاضی بصرہ یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پوتے سے ان کے

بیٹے عبداللہ بن المثنیٰ نے جو روایت کی ہے اس کے الفاظ جو بخاری میں ہیں وہ یہ ہیں۔ عن ثمامۃ عن انس ان ابا بکر لما استخلف بعثہ الی البحرین۔ الحدیث جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس روایت میں ثمامہ نے اس کا اظہار کیا ہے کہ میرے دادا انس رضی اللہ عنہ نے براہ راست اس قصہ کو مجھ سے بیان کیا یعنی حضرت انس کی طرف براہ راست اس کو منسوب کرتے ہیں۔ اب سنئے ان ہی قاضی ثمامہ کے ایک اور شاگرد رشید ہیں۔ جن کا نام حماد بن سلمہ ہے۔ گویا قاضی ثمامہ کے دو شاگرد ہوئے۔ ایک تو ان کے بھتیجے عبداللہ بن المثنیٰ جن سے بخاری کی مذکورہ بالا روایت مروی ہے اور دوسرے شاگرد حماد بن سلمہ۔ عبداللہ بن المثنیٰ کے متعلق اسماء رجال کے جو آراء تھے وہ نقل ہو چکے ہیں اب حماد کا حال بھی سنئے۔ ابن المبارک جیسے جلیل القدر امام کے الفاظ یہ ہیں۔

| | |
|---|---|
| دخلت البصرۃ فما رأیت احدًا اشبہ بمسالک الاول من حماد بن سلمۃ۔ | میں بصرہ گیا تو میں نے حماد بن سلمہ سے بڑھکر کوئی سلف کے مسلک کے قریب نہیں پایا۔ |

ابن حبان نے لکھا ہے کہ

| | |
|---|---|
| کان من العباد المجابین الدعوۃ فی الاوقات ... ولم یکن من اقران حماد بن سلمۃ بالبصرۃ مثلہ فی الدین والفضل والنسک والعلم والکتب والجمع والصلابۃ فی سنۃ والقمع لاہل البدع | حماد بن سلمہ عابد تھے اور وقت ... میں ان کی دعا مقبول ہوتی تھی۔ ان کے ہم عصروں میں دین فضل عبادات علم۔ کتابت جمع احادیث۔ اتباع سنت میں سختی اور ارباب بدعت کا قلع قمع کرنے کے اعتبار سے کوئی ان کی برابر نہ تھا۔ |

عبدالرحمن بن مہدی جیسے امام جلیل کے الفاظ یہ ہیں۔

---

لہ حضرت انسؓ کے صاحبزادے عبداللہ کے دو بیٹے ہوئے۔ ایک کا نام ثمامہ تھا جو قاضی بصرہ ہوئے اور دوسرے کا نام مثنیٰ تھا مثنیٰ کے بیٹے عبداللہ بن المثنیٰ ہیں اور ثمامہ اپنے چچا سے اس حدیث کو روایت کرتے ہیں۔ ابن ماجہ سے اس میں غلطی ہوئی ہے۔

لو قيل لحماد بن سلمة انك تموت غداً ما قدر ان يزيد في العمل شيئاً

اگر حماد بن سلمہ سے کہا جاتا کہ آپ کل مر جائیں گے تو وہ اس کے باوجود بھی عمل میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے تھے۔

حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ

قال عفان قد رأيت من هو اعبد من حماد بن سلمة لكن ما رأيت اشد مواظبة على الخير وقراءة القرآن والعمل لله من حماد بن سلمة

عفان کہتے ہیں میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو حماد بن سلمہ سے زیادہ عبادت گذار تھے لیکن میں ان سے بڑھ کر کوئی شخص اعمال خیر، قرأت قرآن اور عمل للہ کا پابند نہیں سمجھا۔

نیز یہ بھی ہے کہ حافظ ذہبی نے نقل کیا ہے کہ

مات حماد وهو في الصلاة

حماد نماز پڑھتے ہوئے ہی فوت ہوئے تھے

ایک طرف ان ارشادات کو رکھئے اور اس سے متعلق ... ابوداؤد کا فقرہ لم يكن من اهل ... عدله کو سامنے رکھیئے ورنہ تو حماد کی شخصیت کا حال ہے۔ باقی روایت حدیث کی رو سے ان کے متعلق ابن المدینی امام کا قول ہے کہ

من تكلم في حماد بن سلمة فاتهموه في الدين

جس شخص نے حماد بن سلمہ کی شان میں کلام کیا لوگوں نے اس کے دین میں شک کیا

ظاہر ہے کہ کسی کی ثقاہت کے متعلق یہ آخری الفاظ ہو سکتے ہیں۔ حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ

قال الساجي كان حافظاً ثقة مأموناً

ساجی کہتے ہیں حماد حافظ ثقہ اور مامون تھے۔

مگر تقلید کا برا ہو ایک ایسے جلیل القدر امام کے ساتھ چونکہ ایک اتفاقی واقعہ یہ پیش آ گیا کہ حضرت امام بخاری نے حماد بن ابی سلمہ سے ایک ہی روایت بطور اصل کے نقل کی ہے اور چند روایتیں بطور شواہد کے۔ امام بخاری کے صرف اس طرز عمل نے شخصی تقلید پر اصرار کرنے والوں کو تردد میں ڈال دیا

(۹

حالانکہ خود امام بخاری سے حماد بن سلمہ کے متعلق کوئی لفظ منقول نہیں۔ لیکن طریقہ عمل سے لوگوں نے استنباط کیا کہ شاید امام کو ان کی روایتوں پر اعتماد نہیں۔ پھر یک طویل قصہ چھڑ گیا۔ ابن حبان نے اسی بدگمانی میں مبتلا ہو کر کہ امام بخاری قصداً حماد بن سلمہ کی روایتوں سے گریز کرتے ہیں ایک نوٹ کا اضافہ بھی اپنی کتاب میں ان الفاظ کیا۔

لم ينصف من عدل عن الاحتجاج به جس نے حماد سے استدلال کرنے سے گریز کیا ہے اس نے انصاف نہیں کیا

اور غصہ میں پھر امام بخاری پر کچھ تعریضیں بھی کی ہیں۔ مثلاً ابن حبان نے لکھا ہے کہ حماد بن سلمہ سے تو اعراض کیا گیا حالانکہ فلیح اور عبدالرحمن بن عبداللہ بن دینار سے احتجاج کو جائز سمجھا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فلیح جسے خلیفہ ابوجعفر منصور نے صدقات کا عامل مقرر کیا تھا اور یہ اس بات کا انعام تھا کہ حضرت حسن بن علی علیہ السلام کی اولاد کو قید کر دینے کا مشورہ فلیح نے ہی منصور کو دیا تھا۔ ان حالات کے ساتھ ساتھ ائمہ رجال میں ابن معین سے لدارمی نے یہ رائے فلیح کے متعلق نقل کی ہے کہ وہ قوی نہیں تھے ان کی حدیث سے احتجاج نہیں ہو سکتا۔ یحییٰ بن سعید القطان کے متعلق یہاں تک بیان کیا جاتا ہے کہ فلیح کی احادیث سے کپکپاتے تھے۔ امام نسائی کی رائے ہے کہ فلیح ضعیف ہیں۔ تاہم فقہ میں تقلید کے انکار کرنے والوں کو کہنا پڑا جیسا کہ الحاکم صاحب مستدرک نے لکھا ہے۔ حافظ ابن حجر اس تقلیدی رائے کو ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔

قال الحاکم ابو عبداللہ اتفاق حاکم ابوعبداللہ فرماتے ہیں۔ شیخین کا فلیح پر متفق ہو جانا

الشيخين عليه يقوى امره۔ ان کے معاملہ کو قوی کر دیتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ فلیح کے متعلق چونکہ بخاری نے اپنی صحیح میں اعتماد کیا ہے اور ان سے بہت کچھ روایت کی ہے اس لئے امام کی تنقیدی قوت پر اعتماد کرنے والوں کو بہرحال ماننا پڑا کہ فلیح اب اس سلسلہ میں داخل ہے۔

رہے عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن دینار کہ رجال کے تمام ائمہ کو ان کے ضعف پر اصرار ہے لیکن بایں ہمہ امام بخاری نے اس میں بھی لوگوں کا خلاف کیا ہے۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ یہ بتانے کے لئے کہ تقلید کا رواج صرف فقہ ہی میں نہیں بلکہ حدیث میں بھی ہے۔ میں نے ابن حبان کے اس فقرہ کی تھوڑی سی تشریح کردی۔ میں اصل مسئلہ کی طرف یعنی حماد بن سلمہ کے متعلق جو امام بخاری نے طرزِ عمل اختیار فرمایا ہے اس کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ابنِ حبان نے امام بخاری کے طرزِ عمل سے جو استنباط کیا کہ حماد کے متعلق ان کی رائے کچھ اچھی نہ تھی صرف یہ استنباطی بات ہے۔ خصوصاً جبکہ امام کی کوئی تصریح بھی اس سلسلہ میں موجود نہیں ہے۔ پس مناسب رائے وہی ہے جسے حافظ ابن حجر نے ابو الفضل بن طاہر کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ

ان مسلما اخرج احادیث اقوام — امام مسلم نے ایسے بہت لوگوں کی احادیث درج کی ہیں جن کی
ترك البخاری حدیثهم — حدیثوں کو امام بخاری نے ترک کردیا تھا

یعنی صرف ترک سے لازم نہیں آتا کہ امام بخاری کے نزدیک حماد متروکین میں تھے۔ روات میں ایسے لوگ بھی ہیں جن سے بخاری نے روایت نہیں کی لیکن ان ہی کے بمقابل امام مسلم نے ان کی روایتوں کو لیا ہے۔ ابن طاہر نے اس کے بعد لکھا ہے کہ۔

کذلك حماد بن سلمة امام کبیر — یہی حال حماد بن سلمہ کا ہے وہ امام کبیر ہیں۔ اماموں نے ان
مدحه الائمة واطنبوا لما — کی مدح کی ہے اور خوب کی ہے۔ کیونکہ بعض حدیث
تکلم بعض منتحلی المعرفة — کے علم کا دعویٰ کرنے والوں نے کلام کرتے ہوئے
ان بعض الکذبة ادخل فی — یہ بھی کہا ہے کہ بعض جھوٹے لوگوں نے ان کی حدیث میں
حدیثه مالیس منه۔ — ایسی چیزیں داخل کردی ہیں جو اس میں نہیں ہیں۔

پھر امام بخاریؒ کی طرف سے یہ عذر پیش کیا ہے کہ اصل میں اگر ان کی روایت امام نے نہیں لی ہے

توکیا توابع وشواہد میں بھی لینا ان کی توثیق کے لئے کافی نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حماد کی توثیق کرنے والوں سے امام بخاری کو جو مستثنیٰ کیا جاتا تھا صحیح نہیں ہے اور بجز ان چند لوگوں کے جنھیں ابن طاہر نے منتحل الرد کا خطاب دیا ہے۔ حماد بن سلمہ کے متعلق کسی کو کوئی کلام نہیں ہے۔ البتہ خاص ان روایتوں کے متعلق جو قیس بن سعد کے حوالہ سے روایت کرتے تھے لوگوں کا بیان ہے کہ ضاع کتاب حماد عن قیس بن سعد وکان یحدثھم من حفظہ اس لئے خاص ان روایتوں کے متعلق شبہ ہے۔

لیکن جہاں تک میں نے ائمہ رجال کے اقوال کا تتبع کیا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس فقرہ سے حماد کے حافظہ کی تعریف ہی مقصود ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قیس بن سعد کے دوسرے شاگردوں سے جب حماد کی روایتیں ملائی گئی ہیں تو ان میں فرق نہ ہوتا تھا۔ ایک اور اعتراض حماد بن سلمہ پر یہ بھی کیا جاتا ہے جیسا کہ بیہقی سے منقول ہے کہ

هو احد ائمة المسلمين مسلمانوں کے ایک امام ہیں لیکن جب بوڑھے ہوگئے تھے

الا انه لما كبر ساء حفظه تو ان کا حافظہ خراب ہوگیا تھا۔

لیکن بیہقی کے سوا اور کسی محدث سے یہ بات منقول نہیں ہے۔ باقی جیسا کہ ابن معین کا فیصلہ ہے اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ثابت البنانی کے شاگردوں میں حماد کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ اور میرے سامنے اس وقت حماد کی وہی روایت ہے جو ثابت سے وہ روایت کرتے ہیں۔ بات کو مختصر کرنے کے لئے میں اسی پر قناعت کرتے ہوئے اب بتانا چاہتا ہوں کہ امام طحاوی رح قاضی ثمامہ کی اس روایت کو جو عبداللہ بن المثنیٰ سے مروی ہے اور قاضی صاحب ہی کے دوسرے شاگرد حماد بن سلمہ سے بھی روایت جن الفاظ میں مروی ہے دونوں میں مقابلہ کرتے ہیں۔ عبداللہ بن المثنیٰ کے الفاظ تو گزر چکے۔ اب حماد بن سلمہ اسی حدیث کو ثمامہ سے جن الفاظ میں نقل کرتے ہیں وہ یہ ہے۔

قال حماد بن سلمة ارسلني ثابت البناني حماد بن سلمہ کہتے ہیں مجھ کو ثابت البنانی نے

| | |
|---|---|
| الی ثمامة بن عبد اللہ بن انس الانصاری | ثمامہ بن عبد اللہ کے پاس اس بات بھیجی کہ میں |
| رضی اللہ تعالیٰ عنہ لیبعث الیہ | ان سے وہ کتاب لے لوں جو حضرت ابو بکر صدیق |
| بکتاب ابی بکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ | نے حضرت انس کے نام ان کو صدقہ وصول کرنے |
| الذی کتبہ لانس بن مالک رضی اللہ | کے لیے بھیجتے وقت لکھی تھی۔ حماد کہتے ہیں۔ ثمامہ |
| تعالیٰ عنہ حین بعثہ مصدقا قال | بن عبد اللہ نے مجھکو وہ کتاب دیدی تو میں نے |
| حماد فدفعہ الی فاذا علیہ خاتم رسول اللہ | دیکھا کہ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر |
| صلی اللہ علیہ وسلم واذا فیہ ذکر الصدقات | تھی اور اس میں صدقات کا ذکر تھا |

طحاوی کا بیان ہے کہ

| | |
|---|---|
| ان حدیث ثمامة بن عبد اللہ انما | ثمامہ کی حدیث کو صرف عبد اللہ بن المثنی نے |
| وصلہ عبد اللہ بن المثنی وحدہ | بسند متصل بیان کیا ہے۔ ان کے علاوہ ہم کو کسی اور کے |
| لانعلم احدا وصلہ غیرہ | متعلق معلوم نہیں کہ انھوں نے بھی ایسا کیا ہو۔ |

اور عبد اللہ بن المثنی کے متعلق آئمہ رجال کے جو آراء ہیں وہ گزر چکے اسی بنیاد پر امام طحاوی فرماتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| وانتم لا تجعلون عبد اللہ بن المثنی حجة | تم لوگ عبد اللہ بن مثنی کو حجت نہیں مانتے۔ |

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام طحاوی کی آئمہ رجال کے آراء پر کتنی نظر تھی۔ میں نے تو تہذیب التہذیب کے حوالے سے ان آراء کو جمع کیا ہے اور وہ بھی طحاوی کے اشارہ سے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طحاوی نے جو دعویٰ کیا ہے کہ "عبد اللہ بن المثنی کی حجیت میں محدثین کو کلام ہے وہ کس حد تک صحیح ہے اس کے بعد طحاوی لکھتے ہیں کہ

| | |
|---|---|
| ثم قد جاء حماد بن سلمة وقدرہ | یعنی کہ عبد اللہ بن مثنی کے بعد حماد بن سلمہ آتے ہیں ان کا مرتبہ |
| عند اهل العلم فی العلم اجل من | علم میں اہل علم کے نزدیک عبد اللہ بن مثنی سے بڑھا ہوا ہے اور یہ |

فقد رواہ عبداللہ بن المثنی [illegible] لوگوں [illegible] ثابت [illegible] سکتا ہے

آگے [illegible] حماد بن سلمہ کے متعلق جو دو دلیلیں دیا گیا ہے اس سے طحاوی کی علمی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور ان لوگوں کی [illegible] کہ علم [illegible] رجال سے ان کو تعلق نہ تھا۔ یہاں [illegible] ان دونوں [illegible] عبداللہ بن المثنی اور حماد بن سلمہ کے درمیان مقابلہ کرنے کے بعد نتیجہ پیدا کرتے ہیں کہ

فرواہ حماد مخالفاً [illegible] منقطعاً [illegible] پس ثمامہ سے یہ حدیث منقطعاً روایت کی گئی ہے۔

یعنی عبداللہ بن المثنی کا تو بیان یہ ہے کہ ثمامہ نے اس حدیث کو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب [illegible] حماد [illegible] کہتے ہیں کہ ثمامہ نے صرف کتاب اٹھا کر دیدی تھی [illegible] وہ کتاب [illegible] حضرت انس [illegible] کتاب کے متعلق ثمامہ سے [illegible] تصدیق [illegible] صرف [illegible] اور [illegible] کو سمجھ دیا تھا وغیرہ وغیرہ [illegible] چیزوں کا حماد کی روایت [illegible] نہیں ہے بلکہ [illegible] کتاب کے ایک کتاب حوالہ کر دیا [illegible] دوسرے اصول سے نفع اٹھاتے ہوئے [illegible] طحاوی [illegible] کرتے ہیں

"ہماری [illegible] حدیث کے معاملہ میں [illegible] زیادتی کی طرف التفات نہ کیا گیا"

یعنی ایک ہی حدیث [illegible] جو حافظ [illegible] اعتبار [illegible] یعنی ثمامہ کے شاگرد حماد بن سلمہ [illegible] انقطاع کی شکل [illegible] روایت کو بیان کرتے ہیں اور ان ہی ثمامہ کا دوسرا شاگرد عبداللہ المثنی جنھیں حماد سے کوئی نسبت نہیں [illegible] روایت کو متصل کر کے بیان کرتے ہیں مذکورۂ بالا اصولی قاعدہ کے پیش نظر یعنی غیر حافظ کی زیادت حافظ کے مقابلہ میں ناقابل [illegible] ہوتی ہے۔ [illegible] طحاوی کہتے ہیں۔

ثمامہ [illegible] اصول کے مطابق یہ [illegible] ثابت ہوئی [illegible] عبداللہ بن المثنی کی حدیث [illegible]

خلاصہ یہ ہے کہ نسخہ صدیقیہ کے متعلق متصل سند صرف عبداللہ بن المثنیٰ کی ہے اس کے سوا اور کوئی سند متصل نہیں ہے۔ پھر جب عبداللہ بن المثنیٰ کے دوسرے ساتھی حماد انقطاعی شکل میں اس کو بیان کرتے ہیں تو ترجیح حماد ہی کی روایت کو ہوگی۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ اس حدیث کا تعلق ثابت البنانی کی روایت سے ہے اور گزر چکا کہ حماد بن سلمہ پر جو کچھ بھی تنقید کی جائے لیکن ثابت کی روایتوں میں وہ تو بالاتفاق اثبت ہیں اس لئے ثابت ہوا کہ شوافع ثمامہ کی روایت کے متعلق جو مدعی تھے کہ "الاثار المنقطعۃ شاھد لقولنا" صحیح نہ ہو کیونکہ جس روایت کو وہ متصل سمجھ رہے ہیں اصول حدیث کے قاعدہ سے بالآخر وہ بھی منقطع روایتوں کے سلسلہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور یہ بات تو یہی ہے کہ ایک شخص کسی کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ہے وہ اٹھا کر ایک مکتوبہ نسخہ دے دیتا ہے اور خود اپنی رائے اس نسخہ کے متعلق کچھ ظاہر نہیں کرتا کہ آیا وہ واقعی کوئی صحیح کتاب ہے یا جعلی ہے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی یہ مشہور کر دے کہ فلاں صاحب نے چونکہ یہ کتاب میرے حوالہ کی ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس کتاب کی نسبت کو بھی صحیح سمجھتے تھے۔ یہ اپنی طرف سے اضافہ ہوگا۔ کیا تعجب ہے کہ عبداللہ بن المثنیٰ کو کچھ اسی قسم کا مغالطہ ہوا ہو اور انھوں نے بجائے اصل واقعہ کے اظہار کے اپنی سمجھ سے یہ فیصلہ کر لیا کہ جب ثمامہ کے پاس اس شکل میں کتاب لکھی ہوئی ہوگی تو یقیناً انھوں نے حضرت انسؓ سے سنا ہوگا اور جو حدیث منقطع تھی اس کو انھوں نے متصل بنا دیا۔ آخر حماد بن ابی سلمہ سے بھی قاضی ثمامہ نے وہی الفاظ کیوں نہ کہے جو عبداللہ بن مثنیٰ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ صرف "دفعہ الی" پر کیوں قناعت کرتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر طحاوی کی یہ گرفت ذرا مستبعد سی معلوم ہوتی ہے لیکن میں نے جس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ امام طحاوی کی نظر کتنی دور پہنچی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حماد بن سلمہ نے صدیقی نسخہ کی سند جس طریقہ سے بیان کی ہے اس کو تو مناولہ

بھی قرار دینا مشکل ہے اس لئے کہ مناولہ کا مطلب محدثین جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ

اعطاء الشیخ الطالب شیئاً من مرویاتہ مع اجازتہ بہ صریحاً اوکنایۃ

مناولہ شیخ کا طالب علم کو اپنی مرویات کا کچھ حصہ مع صریح یا کنائی اجازت کے دے دینا ہے۔

علامہ سخاوی صاحب فتح المغیث نے مناولہ کی مندرجہ بالا تعریف کے بعد لکھا ہے کہ

وھی ضربان مقرونۃ بالاجازۃ الصریحۃ ومجردۃ عنھا

اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ مناولہ اجازتِ صریح کے ساتھ ہو اور دوسری یہ کہ صریح اجازت سے خالی ہو۔

مناولہ کی ان دونوں قسموں میں المقرونۃ کے متعلق یہ لکھکر کہ مقرونہ اجازت کی تمام انواع سے اعلیٰ ہے اور اس کی بہت سی صورتیں ہیں۔ سخاوی لکھتے ہیں کہ۔

والصحیح انھا منحطۃ عن السماع والقرأۃ وھو قول الثوری والاوزاعی وابن المبارک وابی حنیفۃ والشافعی واحمد واسحٰق وغیرھم۔

صحیح یہ ہے کہ اس مقرونہ کا مرتبہ سماع اور قرأت سے گرا ہوا ہے ثوری۔ اوزاعی۔ ابن مبارک ابوحنیفہ۔ شافعیؒ۔ احمدؒ اور اسحاق وغیرہم کی رائے یہی ہے۔

یہ حال تو اس مناولہ کا ہے جس کے ساتھ مناول نے صراحۃً روایت کرنے کی اجازت دی ہو جب وہ سماع اور قرأت دونوں سے فروتر مرتبہ کی چیز ہے اور ائمہ امصار خصوصاً شافعی واحمد واسحاق کا بھی اس پر اتفاق ہے تو مذکورہ بالا صورت جو حماد بن سلمہ کی روایت میں پیش آئی ہے اس کا درجہ کیا ہو سکتا ہے سو ظاہر ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قاضی ثمامہ نے صرف مکتوبہ نسخہ کو اٹھا کر دیدیا۔ نہ اس کی تصریح ہے کہ میں نے انس سے اس کو سنا ہے نہ یہی ہے کہ میں تمہیں یا ثابت البنانی کو اس کی روایت کی اجازت دیتا ہوں۔ الغرض نہ صراحۃً اجازت کا ذکر ہے نہ کنایۃً بلکہ یہ مناولہ کی اگر قسم ہوگی بھی تو بجائے صریحہ کے اسے "مناولہ مجردہ" ہی میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی مشکل ہے کیونکہ سخاوی نے مناولہ مجردہ

کے متعلق بھی لکھا ہے کہ

بان مناولة الكتاب كما تقدم مختصرا على قوله هذا سماعي او من حديثي ولا يقول اروه عني ولا اجزت لك روايته ونحو ذلك۔

شیخ طالب کو کتاب دیدے اور وہ صرف یہ کہے کہ میں نے اس کو سنا ہے یا "یہ میری حدیث ہے" اور یہ نہ کہے کہ تم میری سند سے اس کی روایت کرنا، اور نہ یہ کہے کہ میں تم کو اس کی اجازت دیتا ہوں" وغیرہ ذالک۔

غور کرنے کی بات ہے کہ مناولہ کی جس شکل میں ہذا سمعی وغیرہ کی تصریح کے بعد بھی محدثین اس کو مناولہ مجردہ شمار کرتے ہیں جس کے متعلق امام نووی کا بیان ہے کہ

فلا تجوز الرواية بها على الصحيح الذي قاله الفقهاء واصحاب الاصول وعابوا المحدثين المجوزين بها۔

فقہا اور اصحاب اصول کے قول کے مطابق صحیح یہی ہے کہ اس (مناولہ مجردہ) کی روایت جائز نہیں ہے۔ ان حضرات نے ان محدثین پر نکتہ چینی کی ہے جو اس کی روایت کو جائز قرار دیتے ہیں۔

اور جب ہذا سماعی وغیرہ کی تصریح کے بعد بھی صحیح یہی ہے کہ مناولہ کی اس شکل میں روایت کو مناول کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ انقطاع پیدا ہو جاتا ہے تو اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حماد بن سلمہ والی روایت میں جو صورت پیش آئی ہے وہ مناولہ مجردہ کے تحت میں بھی درج نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں عبداللہ بن المثنی کے اتصال پر طحاوی انقطاع کو اگر ترجیح دیتے ہیں تو محدثین کے مقررہ اصول کی بنا پر اس کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ امام رازی اصولیوں میں وہ شخص ہیں جن کا خیال مناولہ کے باب میں یہ ہے کہ

انه لم يشترط الاذن بل ولا المناولة بل اذا اشار الى كتاب وقال هذا

اذن کی بلکہ مناولہ کی شرط ہی نہیں۔ بلکہ جب شیخ کسی کتاب کی طرف اشارہ کرے اور کہے کہ میں نے اس کو فلاں سے

سماعی من فلان جاز لمن — سنا ہے تو اب یہ سننے والے کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کی روایت
سمعہ ان یرویہ عنہ سواء — شیخ کی سند سے کردے۔ خواہ شیخ نے اس کتاب کا مناولہ کیا ہو یا
ناولہ اولم یناولہ وسواء قال لہ — نہ کیا ہو اور اس نے یہ کہا ہو یا نہ کہا ہو کہ تم میری سند سے اس
اروہ عنی ام لا۔ — کی روایت کر دینا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ھذا سماعی من فلان" وغیرہ جیسے الفاظ کی تصریح کی ضرورت بہرحال اتصال کے لئے باقی ہے۔ مگر حماد بن سلمہ کی روایت میں تو یہ بات بھی پائی نہیں جا سکتی پھر ان کو ثمامہ سے روایت کرنا جیسا کہ عبداللہ بن المثنیٰ نے کیا ہے کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ یہ خیال کہ حماد بن سلمہ کے ساتھ قاضی ثمامہ نے ممکن ہے یہی سلوک کیا ہو لیکن اپنے بھتیجے عبداللہ بن المثنیٰ کو انھوں نے ھذا سماعی وغیرہ کہا ہو۔ بلاشبہ اس کی گنجائش ضرور ہے مگر طحاوی کے اس اعتراض کا کیا جواب ہے کہ "تمہاری رائے میں غیر حافظ کی زیادتی کا حافظ کے مقابلہ میں اعتبار نہیں کیا جائیگا۔"

حماد بن سلمہ کے مقابلہ میں عبداللہ بن المثنیٰ کی زیادت کی طرف التفات کیسے جائز ہو سکتا ہے اور اتصال کی بنیاد لے دے کر وہی عبداللہ بن المثنیٰ کی زیادت پر مبنی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ صحیح بخاری کی ایک متصل روایت کے اتصال کو انقطاع کے ساتھ بدل دینا یہ فنِ اسناد کی اعلیٰ مہارت کے بغیر ناممکن ہے۔ میں نے جن نکتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جب تک یہ ساری باتیں کسی کے پیش نظر نہ ہوں گی ناممکن ہے کہ اس مخفی سقم کی طرف اس کی توجہ منعطف ہو سکے۔ طحاوی کے کمال فن دانی کا یہ کافی ثبوت ہے۔ یہ نو شوافع کی پہلی متصل حدیث کی تنقید تھی۔

رہی دوسری حدیث جس کے اتصال کے وہ مدعی ہیں اور شاھدہ مقولنا کا دعوی جس بھروسہ پر کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ عامل نجران حضرت عمرو بن حزم الانصاری رضی اللہ عنہ کی جس کتاب الصدقات کا میں چار کتابوں کے سلسلہ میں ذکر کر چکا ہوں۔ اس نسخہ کے متعلق دو مختلف روایتیں ہیں ایک نسخہ تو نہ د

کی سند سے منقول ہے اور دوسرا نسخہ وہی حماد بن سلمہ بصری کا ہے جسے وہ قیس بن سعد کے توسط سے روایت کرتے تھے۔ حماد بن سلمہ کے نسخے کا ذکر تو بعد کو کیا جائے گا۔ عمرو بن حزم کی کتاب ازہری کی سند سے جو منقول ہے اس کے لحاظ سے شوافع کے نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے۔ بیہقی نے زہری کی سند سے اس نسخہ کو روایت کرکے ائمہ نقل میں سے ابوزرعہ رازی، ابوحاتم رازی، عثمان بن سعید الدارمی کے ناموں کی صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ان بزرگوں نے بھی اور

| | |
|---|---|
| جماعة من الحفاظ وهو هذا الحديث الذي رواه في الصدقة موصول الاسناد حسناء والله اعلم (بیہقی ج ۴ ص ۹۰) | حفاظ کی ایک جماعت نے سند متصل کے ساتھ اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ |

ظاہر ہے کہ جس حدیث کے متعلق مذکورہ بالا ائمہ نقل اور دیگر جماعت حفاظ نے اتصال اور حسن کا دعویٰ کیا ہو وہ اگر شوافع کے لئے سرمایۂ افتخار بن گئی ہو تو کیا تعجب ہے۔ لیکن اب آیئے اور ابوجعفر طحاوی کی فنی حذاقت کا تماشا کیجئے وہ لکھتے ہیں کہ

| | |
|---|---|
| واما حديث الزهري عن ابي بكر بن محمد بن عمرو بن حزم فانما رواه عن الزهري سليمان بن داؤد۔ | زہری کی اس روایت کے راوی سلیمان بن داؤد ہیں۔ |

امام طحاوی نے سلیمان کے لفظ کو پکڑا ہے اور پوچھنا چاہتے ہیں کہ یہ کون شخص ہے پھر خود جواب دیتے ہیں کہ زہری کے شاگردوں میں ایک تو سلیمان بن داؤد وہ شخص ہے جو عمر بن عبدالعزیز سے روایت کرتا ہے۔ طحاوی نے مانا ہے کہ بلاشبہ یہ سلیمان تو ثقہ ہیں۔ خود لکھتے ہیں کہ

| | |
|---|---|
| سليمان بن داؤد الذي يروي عن عمر بن عبدالعزيز عندهم ثبت | وہ سلیمان بن داؤد جو عمر بن عبدالعزیز سے روایت کرتے ہیں ثقہ ہیں۔ |

اور یہ واقعہ بھی ہے کہ یہ سلیمان بن داؤد دراصل حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حاجب تھے ان کا اصل وطن داریا تھا۔ داریا کی تاریخ جو قاضی ابوعلی خولانی نے لکھی ہے اس سے حافظ ابن حجر نے یہ

نقرہ نقل کیا ہے۔ کان حاجب لعمر بن عبدالعزیز وکان مقدما عنده وولده بداریا الی الیوم [1]

ظاہر ہے یہ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے دربار کی حجابت خود ان کی توثیق کی کافی دلیل ہے بیہقی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ

| | |
|---|---|
| فدلتنی علی سلیمان بن داؤد الخولانی هذا | خولانی، ابوزرعہ، ابوحاتم، عثمان بن سعید |
| وابوزرعۃ الرازی وابوحاتم الرازی وعثمان | اور حفاظ حدیث کی ایک جماعت نے سلیمان |
| بن سعید الدارمی وجماعۃ من الحفاظ [2] | بن داؤد کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔ |

مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ سلیمان بن داؤد کی صداقت و ثقاہت میں کسی کو اعتراض نہیں لیکن دریافت طلب یہ بات ہے کہ یہ سلیمان کیا وہی حاجب عمر بن عبدالعزیز ہیں۔ عجیب بات ہے واللہ اعلم بالصواب۔ اس راز کو پہلی دفعہ کس نے طشت از بام کیا کہ زہری سے اس حدیث کو جس سلیمان نے روایت کیا ہے وہ عمر بن عبدالعزیز والے سلیمان نہیں ہیں۔ مشہور امام حدیث صالح جزرہ ہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے یہ انکشاف کیا کہ سلیمان سے اس روایت کو نقل کرنے والے یعنی ان کے شاگرد جن کا نام یحییٰ بن حمزہ ہے مجھے ان کی اصل کتاب مل گئی۔ اس روایت کو صالح جزرہ نے یحییٰ بن حمزہ کی کتاب میں جو دیکھا تو عجیب تماشا نظر آیا۔ ان کا بیان ہے کہ

| | |
|---|---|
| نظرت فی اصل کتاب یحیی بن حمزۃ | صدقات کے سلسلہ میں عمرو بن حزم کی حدیث |
| حدیث عمرو بن حزم فی الصدقات | میں نے یحییٰ بن حمزہ کی اصل کتاب میں دیکھی کہ |
| فاذا هو عن سلیمان بن ارقم | اس کے راوی سلیمان بن ارقم ہیں۔ |

ان کے ہوش جاتے رہے کہ دنیا کیسے شدید مغالطہ میں پڑی ہوئی تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ عمر بن عبدالعزیز والے سلیمان تو مشہور ثقات میں سے تھے لیکن یہ سلیمان بن ارقم اسی درجہ غیر معتبر آدمی ہیں۔

[1] تہذیب ج ۴ ص ۱۸۶۔ [2] السنن ج ۴ ص ۹۰۔

ائمہ نقد نے اس شخص کے متعلق "لیس بشیٔ" "لیس یساوی فلسا" "لیس بثقۃ" "روی احادیث مناکیر" "ترکوہ" "متروک الحدیث" "ذاھب الحدیث" "ساقط" "عامۃ ما یرویہ لا یتابع علیہ" "لا یکتب حدیثہ" حتی کہ "کان یقلب الاخبار" "وروی عن الثقات الموضوعات" یہ سارے الفاظ ائمہ رجال سے حافظ نے تہذیب میں نقل کئے ہیں۔ اسی لئے ترمذی نے تصریح کر دی ہے کہ سلیمان بن ارقم "ضعیف عند اھل الحدیث" امام احمد بن حنبل سے تو کسی نے سلیمان بن ارقم کی ایک حدیث کے متعلق کہا کہ اس کا راوی سلیمان ہے۔ بولے "لا تبالی من روی امہ بررو"

محمد بن عبد اللہ الانصاری قاضی جن کا پہلے ذکر گزر چکا ہے کہا کرتے تھے کہ

کانوا ینھونا عنہ ونحن شبان ہمیں تو عنفوان شباب ہی میں ان کی روایتیں لینے سے منع کیا جاتا تھا۔

صالح جزرہ پر جب اس حقیقت کا انکشاف ہوا تو اپنے ہم عصر محدثین سے انھوں نے اس کا تذکرہ شروع کیا۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے جب امام مسلم صاحب صحیح سے اس مغالطہ کا قصہ بیان کیا تو

کتب عنی مسلم بن الحجاج ھذا الکلام مسلم بن حجاج نے میرے اس بیان کو قلمبند کر لیا۔

جس کے یہ معنی ہوئے کہ امام مسلم نے اسے ایک بڑا قیمتی انکشاف قرار دیا اور صرف صالح جزرہ ہی نہیں ان کے بعد بھی لوگوں کو اس کی جستجو رہی اور یحیی بن حمزہ کے اصل نسخہ کو تلاش کر کر کے دیکھا گیا کہ واقعہ وہی ہے جو کچھ صالح کا بیان تھا اس کی توثیق کرنی پڑی۔ حافظ نے تہذیب میں لکھا ہے کہ

قال الحافظ ابو عبد اللہ بن مندہ حافظ ابو عبد اللہ بن مندہ کا بیان ہے کہ میں نے یحیی
قرأت فی کتاب یحیی بن حمزۃ بخطہ عن بن حمزہ کی کتاب میں پڑھا کہ زہری سے روایت
سلیمان بن ارقم عن الزھری۔ کرنے والے سلیمان بن ارقم ہیں۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ کتنا عظیم مغالطہ تھا۔ ایسا مغالطہ کہ بڑے بڑے ائمہ نقد بھی اس مغالطہ کے تاثر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ابھی بیہقی کے حوالے سے بات گزر چکی کہ ابو زرعہ، ابو حاتم الدارمی جیسے

بزرگوں نے اس حدیث کی تحسین کی۔ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ جیسے محتاط امام کے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے کہ

سئل عن حدیث الصدقات ھذا الذی | امام احمد سے اس حدیث صدقات کی صحت کے متعلق
یرویہ یحیی بن حمزۃ اصحیح ھو۔ | جس کے راوی یحیی بن حمزہ ہیں دریافت کیا گیا۔

سلیمان بن ارقم کو سلیمان بن داؤد خیال کرکے امام نے فرمایا کہ

ارجوان یکون صحیحا | مجھے توقع ہے کہ یہ صحیح ہے

ورنہ ظاہر ہے کہ سلیمان کو سلیمان بن ارقم جانتے ہوئے بھلا کسی کو اس حدیث کی تصحیح کی جرأت ہوسکتی ہے مگر پچھلے رواۃ نے یحیی بن حمزہ کی کتاب سے بجائے ارقم کے داؤد خدا جانے کس بنا پر نقل کرلیا بات پھیل گئی۔ تحقیق کے بعد اس کا پتہ چلالیا گیا کہ یحیی بن حمزہ کے شاگرد حکم بن موسیٰ کی غلطی تھی کہ بجائے ارقم کے داؤد کا لفظ ان کو یاد رہ گیا اور یہی غلطی کی بنیاد تھی۔ بہرحال یہ تو اس مغالطہ کی تاریخ تھی۔ آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ ایسا مغالطہ جس سے امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ بھی محفوظ نہ رہ سکے امام مسلم کے لئے وہ انکشاف سے بڑی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے فوراً انھوں نے اسے نوٹ کرلیا۔ لیکن اب ظلم کا کوئی ٹھکانا ہے کہ جس شخص کی وسعت نظر نے اس کو اس غلطی میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھا یعنی ابوجعفر طحاوی، لوگوں کو ان کے محدث ہونے اور فن اسناد کی واقفیت میں کلام ہے آپ دیکھتے ہیں کہ انھوں نے فوراً زہری کے شاگرد سلیمان کو سند کے بیچ سے نکال لیا اور یہ اعلان کرتے ہوئے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ والے سلیمان تو بے شک ثقہ ہیں لیکن یہ وہ سلیمان نہیں ہے۔ پھر اپنے استاد ابن ابی داؤد کے حوالہ سے یہ فقرہ نقل کرتے ہیں کہ

سمعت ابن ابی داؤد یقول سلیمان | میں نے اپنے استاد ابن داؤد کو یہ کہتے ہوئے سنا
بن داؤد ھذا ھو سلیمان بن داؤد الحرانی | یہ سلیمان بن داؤد اور سلیمان بن داؤد حرانی

عندھم ضعیفان جمیعًا۔ محدثین کے یہاں ضعیف ہیں۔

افسوس ہے کہ اس فقرہ میں سلیمان کے ساتھ اگر ابن داؤد کا لفظ دونوں اسماء کے ساتھ نہ ہوتا تو بآسانی دعویٰ کیا جاسکتا تھا کہ صلح جزرہ کے انکشاف ہی کو طحاوی دہرا رہے ہیں لیکن ابن داؤد کے اضافہ نے اس میں شک نہیں کہ بات کی وہ حیثیت نہیں رکھی ہے تاہم میرا خیال ہے کہ یہ ناسخ اور معانی الآثار کے کاتبوں کی غلطی ہے یا مصحح صاحب نے اپنے کمالِ علم کا اظہار داؤد کے لفظ کے اضافہ سے کیا ہے اور اس قسم کی غلطیاں بکثرت معانی الآثار اور مشکل الآثار دونوں میں پائی جاتی ہیں مگر جب آگے طحاوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ

وسلیمان بن داؤد الذی یروی عن عمر بن عبدالعزیز عندھم ثبت

وہ سلیمان بن داؤد جو عمر بن عبدالعزیز سے روایت کرتے ہیں ائمہ جرح و تعدیل کے نزدیک ثقہ ہیں۔

اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ زہری کے شاگردوں میں سلیمان بن داؤد سے تو واقف تھے اور اس سے بھی کہ زہری کی اس روایت میں عمر بن عبدالعزیز والے سلیمان نہیں ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، طحاوی نے صرف "سلیمان ھذا" لکھا ہوگا اور مراد اس سے وہی سلیمان بن ارقم ہے لیکن واللہ اعلم بن داؤد کا اضافہ کیسے ہوگیا۔ بہرحال اگر اس اضافہ سے قطع نظر کر لیا جائے تو طحاوی نے وہی بات کہی ہے اور اسی راز کا افشا کیا ہے جو اس روایت میں پایا جاتا تھا اور اس اضافہ کو اگر رہنے بھی دیا جائے جب بھی آدھی بات کہ یہ عمر بن عبدالعزیز والے سلیمان نہیں ہیں اس پر تو طحاوی نے بھی تنبیہ کی اور اس پر بھی کہ جس سلیمان کا یہاں ذکر کیا گیا ہے یہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ مدعا کے اثبات کے لئے اتنی بات کافی ہے۔

(باقی آئندہ)